صرف اپنے ملک کی فکر کیجئے؟

متحدہ عرب امارات، سات چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا ایک مجموعہ ہے۔ آبادی بھی ہمارے مقابلہ میں بس واجبی سی ہے۔ صرف ایک کروڑ نفوس، جس میں سے نوے فیصد لوگ باہر سے آئے ہوئے ہیں یعنی غیر ملکی ہیں۔ سات ریاستوں میں دوبئ کو تقریباً پوری دنیا جانتی ہے۔ دراصل دوبئ تضادات کا ایک مجموعہ ہے جس کی مثال دنیا میں شاید کہیں موجود ہو، مگر اسلامی دنیا میں اس طرح کا بھرپور شہر دیکھنے میں نظر نہیں آتا۔ دوبئ ایک حد درجہ ترقی یافتہ اور زندہ دل شہر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ عام لوگوں کا خیال ہو کہ دوبئ، تیل کی آمدنی کی بدولت ترقی کی اوجِ ثریا پر براجمان ہے۔ مگر یہ گمان مکمل طور پر ناقص ہے۔ سات ریاستوں پر مشتمل اس ملک میں دوبئ، وہ واحد ریاست ہے جہاں تیل کے ذخائر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یعنی جو زمینی دولت، ابوظہبی یا متصل ریاستوں کو حاصل ہے، دوبئ اس سے یکسر محروم ہے۔ مگر پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوبئ، تیل کے بغیر محیر العقول ترقی کیسے کر گیا۔ یہ سوال آپ کے سامنے بھی رکھنا چاہتا ہوں۔ ذرا بتائیے کہ قدرتی وسائل کے بغیر، یہ ریاست یا شہر، دنیا کی آنکھ کا تارا کیونکر ٹھہرا۔ اس کا جواب ہرگز ہرگز سادہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا جواب ہمارے جیسے ملک کے عوام اور حکمران دونوں کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ مگر قیامت تو یہ ہے کہ ہمارے جیسے بدقسمت اور بدحال ملک کے لئے کوئی نازک سے نازک مسئلہ بھی فکر اور تدبر کا باعث نہیں ہے۔ اس جوہری نکتہ پر میں تھوڑی دیر میں معروضات پیش کرتا ہوں۔ خیر جواب، آپ کا اپنا بھی ہوسکتا ہے، میری سوچ سے قدرے مختلف۔ یہ بھی یاد رہے کہ متحدہ عرب امارات، مکمل طور پر اسلامی مملکت ہے۔ یہاں کے مقامی لوگ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ ان کے قوانین بھی اسلامی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہاں مغربی مالک سے گورے، ہر جانب نظر آتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہر ملک سے لوگ آ بھی رہے ہیں اور روزگار بھی حاصل کر رہے ہیں۔ دراصل اس ملک کی اصل کامیابی اس کے حکمرانوں کی وہ حد درجہ ترقی پسند اور زمانے کے ساتھ چلنے کی عملی پالیسیاں ہیں، جس کی مثال اسلامی ممالک خصوصاً پاکستان میں کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ ذرا سوچیے، چار یا پانچ دہائیاں پہلے کا پسماندہ صحرا، آج خیرہ کن شہر کیونکر ہے؟ دوبئ میں ریت کے ٹیلے، کچے گھر، واجبی سی بندرگاہ اور پسماندگی اور ناخواندگی کا دور دورہ تھا۔ مگر پھر یہ معاشی اور معاشرتی انقلاب کیسے برپا ہوا۔ خدارا، اس پر غور کیجیے۔ دراصل ہوا یہ ہے کہ دوبئ کے حکمرانوں نے یہ ٹھان لی کہ وہ کسی لحاظ سے بھی دنیا سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ جدید دنیا کے تمام تقاضے پورے کریں گے اور پھر ریاست، ان معاملات پر پہرا دے گی۔ دوبارہ عرض کروں گا کہ انہوں نے دین کو ترقی کی راہ میں آڑے نہیں آنے دیا۔ ہمارے جیسے ملکوں سے مزدور منگوائے اور ایک مستحکم انفراسٹرکچر بنا ڈالا۔ ماڈرن سڑکیں، جدید ہوٹل، فقید المثال شاپنگ مالز قائم کیے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ حکومت کی رٹ اتنی سختی سے قائم کی کہ کوئی کار، رات کو بھی سرخ بتی کراس کی جسارت نہیں کرسکتی۔ امن وامان اتنے جبر سے مستحکم کیا کہ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ سرمایہ کو غیر معمولی تحفظ دے ڈالا۔ مگر معاملہ صرف اس مقام پر نہیں رکتا۔ دوبئ کے حکمرانوں نے پورے ملک میں بارز، شراب خانے، نائٹ کلب اور Personal Pleasures پر کسی قسم کی قدغن نہیں رکھی۔ یہ نازک نکتہ کم از کم ہمارے جیسے دقیانوس ملک کے لئے کافی معنی خیز ہے۔ نتیجہ کیا ہوا۔ پوری دنیا سے سرمایہ دوبئ پہنچنا شروع ہوگیا۔ کرہ ارض پر جتنے بھی امیر لوگ ہیں، انہوں نے اپنے گھر دوبئ میں بنا لئے۔ ہمارے ملک کے صدور، وزراء اعظم اور بڑے آدمی، تمام کے تمام، آج بھی دوبئ میں جائیداد خریدنا محفوظ ترین سرمایہ کاری سمجھتے ہیں۔ نام لینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پاکستان کے ہر صحیح یا غلط طریقے سے امیر بننے والے شخص کا دوبئ میں کوئی نہ کوئی ٹھکانہ موجود ہے۔ دوبئ ہلز میں، بڑے بڑے محلات، پاکستانیوں کے زیر تصرف ہیں۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ کون سا محل کس کا ہے۔ بہرحال دوبئ آج کی دنیا کا تیز رفتار ترقی کرنے کا ایک شاندار نمونہ بن چکا ہے۔ ہاں ایک عرض کرتا چلوں۔ وہاں کے اخبارات اور ٹی وی چینلز، قطعاً حکومت کے خلاف ایک لفظ لکھ یا بول نہیں سکتے۔ مگر ترقی کی قیمت اگر اظہار رائے پر سخت پابندی ہے، تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں۔ ہمارے بدنصیب ملک میں اظہار رائے پر ڈھیل پرویز مشرف کے دور میں برپا ہوئی اور اب تو یہ سوشل میڈیا کی اس غلاظت میں بدل چکی ہے جس نے ملک کو بے یقینی میں مبتلا کر دیا ہے۔ لہٰذا آج بھی اگر بے مثال ترقی، اس مجنونانہ اظہار رائے پر مکمل پابندی سے برپا ہوتی ہے تو پھر ہمیں ترقی کو چن لینا چاہئے۔ آپ دوبئ کو رہنے دیجئے۔ کیا چین کی خیرہ کن ترقی کے ساتھ ساتھ میڈیا کا عنصر موجود ہے، جواب مکمل نفی میں ہے۔

دوبئ کی داخلی ترقی سے ہٹ کر اب میں ایک حد درجہ نازک نکتہ کی طرف آنا چاہتا ہوں۔ اور وہ متحدہ عرب امارات کی خارجہ پالیسی ہے۔ ان کی بیرونی ساکھ کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ ہمارا ملک کسی بھی ملک کا دشمن نہیں۔ کسی بھی مذہبی ریاست سے ہمارا کوئی تنازع نہیں۔ ہم سب کے دوست ہیں اور کھلے بازوؤں سے ہر ایک کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ایران کے ساتھ جو فکری اختلاف تھا یا ہے، اسے بھی انہوں نے تجارت کے ذریعے ختم کر ڈالا۔ ایران پر بھرپور پابندیوں کے باوجود، ایرانی تیل کی بین الاقوامی نقل وحرکت، دوبئ کی بندرگاہوں سے ہی ہوتی ہے۔ کیا یہ خارجہ پالیسی کی معراج نہیں کہ وہ ہندوستان سے بھی قریبی تعلقات رکھتے ہیں اور پاکستانی بھی دوبئ کو اپنا دوسرا گھر گردانتے ہیں۔ سعودی عرب بھی وہاں سرمایہ کاری کرتا ہے۔ اور اسرائیل کے ساتھ بھی ان کے قریبی تعلقات ہیں۔ یعنی ایک دوسرے کے دشمن ممالک، دوبئ کے ساتھ حد درجہ خوشگوار تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اور پھر ہمارے جیسے فقیر ملک بھی، ان کے حکمرانوں کے در پر بھیک مانگنے اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ خارجہ پالیسی کی یہ کامیابی، ایک سنجیدہ سوچ کی مظہر ہے۔ جس میں اماراتی حکمرانوں نے محسوس کر لیا کہ ان کی کامیابی کس قسم کی مذہبی، لسانی، معاشرتی یا معاشی منفی پن میں نہیں ہے۔ اور پھر ان ذہین ترین لوگوں نے اس پالیسی کو اپنا قومی شعار بنا لیا۔ آپ دوبئ جائیے، تو آپ کو ان گنت مقامات پر پاکستانی اور ہندوستانی اکٹھے کام کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ایک ساتھ کھانا کھاتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ یہودی مرد اور خواتین، اپنے روایتی لباس میں بڑے سکون سے چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ مغربی ممالک کی خواتین سکرٹ پہنے ہوئے محفوظ طریقے سے چہل قدمی کرتی نظر آئیں گی۔ یعنی کہ دنیا کے ان گنت ممالک سے مرد اور خواتین اپنی مرضی کا لباس پہن کر باہر آسکتے ہیں اور ان پر کسی قسم کی کوئی قدغن نہیں ہے۔

اب میں اپنے اس بیانیہ کو الٹا کر کے پاکستان کی طرف لوٹتا ہوں۔ ہمارے ملک کو ستر برس سے ایک ادنیٰ لیبارٹری میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ہماری درسی کتب میں باور کروایا جاتا ہے کہ ہمارا ملک، اسلام کا قلعہ ہے۔ اس فقرے کا مطلب کوئی بھی باشعور انسان نہیں سمجھ پاتا اور نہ دوسرے کو سمجھا سکتا ہے۔ ہم اور دیگر بہت سارے مسلمان ملک ہیں۔ مگر ہم اسلام کا قلعہ کیسے بن گئے۔ ہندوستان میں بھی اتنے ہی مسلمان ہیں، جتنے پاکستان میں۔ پھر ہماری صف بندی، اتنی مختلف کیوں ہے۔ اور اس مفروضے پر عمل کرنے یا اسے ترویج دینے سے ہمارے ملک کو فائدہ ہوا یا نقصان؟ اگر ہمارے اردگرد مذہب کی فصیلیں ہیں تو پھر شدت پسند، جہادی مسلمان، وہ ہم پر حملہ آور کیوں ہیں؟ دراصل ضیاء الحق نے ہمارے معاشرے کی سماجی اور مذہبی ترکیب ہی بدل ڈالی ہے۔ اور شاید اب ہمیں نارمل ہونا آتا ہی نہیں ہے۔ عجیب معاملہ یہ بھی ہے کہ ہمیں اپنے علاوہ پوری دنیا کی فکر ہے۔ مگر اپنے ملک کی ترقی اور خوشحالی سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔ فلسطین سے لے کر برما کے روہنگیا مسلمان ہوں یا چین کے اوگر لوگ، ہم ہر طرف لفظی بیان بازی اور شور مچانے سے گریز نہیں کرتے۔ اپنے ملک کی خیر خواہی سے ہمیں کوئی یارا نہیں۔ آج تک کیا کسی فلسطینی مسلمان نے کہا ہے یا حماس یا حزب اللہ نے فرمایا ہے کہ جو دہشت گرد، پاکستان سے لڑ رہے ہیں، ہم افواج پاکستان کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر ان دہشت گردوں کو نیست ونابود کر دیں گے؟ کم از کم میری نظر سے ایسا کوئی بیان گزشتہ چالیس پچاس برس سے نہیں گزرا۔ مگر ہم ان لوگوں کے لئے ہلکان ہیں جو ہمارے کسی مسئلہ پر ہمارے ساتھ کھڑے ہونے سے گریز کرتے ہیں۔ زیادہ بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں اپنے ملک کی سب سے زیادہ فکر کرنی چاہئے۔ اپنے ملک کو خوشحالی کی ٹرین پر گامزن کرنا چاہئے۔ یکسو ہو کر، ایک مضبوط اور متوازن خارجہ پالیسی ترتیب دینی چاہئے جس کا واحد مقصد خطے سے منسلک تنازعات سے دور رہنا ہو۔ مگر یہ کبھی نہیں ہوگا۔ ہم نے ہر وہ قدم اٹھانا ہے جو ہماری استطاعت سے بھی باہر ہو، اور جس سے ساری دنیا ہمارا ٹھٹھا لگا سکے۔ اپنے ملک کی ترقی تو ہمارے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے؟ ابھی بھی وقت ہے، ہمیں جدید فکر کو اپنا کر اپنے ملک کی خیر خواہی پر حد درجہ محنت کرنی چاہئے۔ یہی وقت کا تقاضا ہے۔